ڈاکٹرسلیم اختر کے سفرنامے......رومان یا حقیقت

ڈاکٹر عاصمہ اصغر،ایسوسی ایٹ پروفیسر،شعبۂ اُردو،لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی،لاہور

Abstract

Dr. Saleem Akhtar is a great name of Urdu literature. He wrote criticism, short stories, autobiography, comedy, travelogues and many others. In last quarter century, he has made many people to read his creative works. Travelogue is one of his important creative works. He travelled five countries and presented their civilization, culture, politics and social issues in his travelogues. The speciality of his travelogue is that he avoids extra description, details or exaggeration of the events or happening and give informations to his readers, which are based on reality. Being a psychologist, he deeply observes the mental conditions of people and tries to know about their ideas and emotions to find out the reality and truth, without giving his reference, history of Urdu travelogue is incomplete.

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن ادبی شخصیات نے اپنی فعال ادبی زندگی کے حوالے سے بے مثال خدمات انجام دیں اور اپنے ادبی نظریات کے ذریعے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ان میں ڈاکٹر سلیم اختر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں،اور نقاد بھی ایسے،جنھوں نے روایتی اور مروجہ تنقید سے الگ اُردو تنقید کے نئے گوشے دریافت کیے اور فکری اور ادبی سطح پر کئی نسلوں کی رہنمائی کی،تاہم تخلیقی حوالے سے بھی انھوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع کر لیا کہ اَب ان کے ذکر کے بغیر اُردو افسانے،سفرنامے،شخصیت نگاری اور طنز ومزاح کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے۔اُن کے تخلیقی سفر میں ان کی آپ بیتی ’’نشانِ جگر سوختہ‘‘ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس سے جہاں ان کی ساری زندگی کے نشیب وفراز نگاہ میں آتے ہیں وہاں ان کی بھرپور ادبی زندگی کے تمام زاویے اُجاگر ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

۲۰۱۵ء میں ’’پاکستانی ادب کے معمار‘‘ کے سلسلے کی ایک کتاب ’’ڈاکٹر سلیم اختر:شخصیت اور فن‘‘ کے نام سے ڈاکٹر شاہین مفتی نے مرتب کی۔اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والی اِس کتاب میں ڈاکٹر

سلیم اختر کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف زاویے زیادہ تر اُن کی آپ بیتی سے برآمد کیے گئے ہیں اور ان کے اپنے بیانات کی روشنی میں ان کی شخصیت کی نقش گری کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تخلیقی جہات کے حوالے سے شاید پہلی بار اُن کے افسانوں کو زیرِ بحث لا کر ان کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کی خاکہ نگاری، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کے حوالے سے قابلِ لحاظ مواد فراہم کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقی زندگی کے ایک اہم پہلو، یعنی سفرنامے پر اظہار خیال کے لیے خاتون مرتّب کے مبلغ علم کا اظہار محض پون صفحے میں ہوا ہے۔ گویا ہمیشہ کی طرح اس کتاب میں بھی ڈاکٹر سلیم اختر کا سفرنامہ توجہ حاصل نہیں کر سکا۔ جبکہ اس مختصر تحریر میں اِس امر کا اعتراف موجود ہے کہ:

''مصنف نے کسی مقام پر بھی قارئین کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیا۔''(۱)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے سفر میں قاری کو اپنی انگلی تھما کر یوں ساتھ لیے چلتے ہیں کہ اُسے کسی مقام پر بھی خود سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ وہ نہ تو واقعات کے ہجوم میں اُسے گم ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی احساس اور کیفیت کی سطح پر اس سے اُنگلی چھڑاتے ہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام پر اُسے ساتھ رکھتے اور اُسے اپنی دلچسپیوں میں شریک کرتے ہیں۔ ایک عمدہ سفرنامے کی یہی خصوصیت ہے جسے ڈاکٹر سلیم اختر کے یہاں بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور یہی چیز انھیں ہمارے درجہ اوّل کے سفرنامہ نگاروں کی فہرست میں جگہ دیتی ہے۔

تخلیقی سطح پر ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک نمایاں پہچان ان کا افسانہ ہے۔ چناں چہ وہ آپ بیتی لکھ رہے ہوں یا خاکہ نگاری میں کسی شخصیت کے خدوخال اُجاگر کر رہے ہوں، وہ اپنے افسانوی اُسلوب کو ایک زائد حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے سفرناموں میں بھی کئی مقامات پر جزوی طور پر یہ اُسلوب دَر آیا ہے۔ یوں تو جدید سفرنامہ نگاروں کے یہاں کم و بیش افسانوی رنگ ہی غالب نظر آتا ہے مگر ڈاکٹر سلیم اختر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کے علاوہ اپنی تحقیق، تاریخ شناسی اور واقعات نگاری کی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور سفرنامے کو ہمہ رنگ جہتوں سے آشنا کر کے اسے ایک جہان رنگ و بُو کی صورت دے دی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے تین ملکوں (بھارت، ماریشس اور ڈنمارک) کے سفرناموں پر مشتمل پہلی کتاب ''عجب سیر تھی'' ۲۰۰۳ء میں فیروز سنز، لاہور نے شائع کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کئی بار بھارت گئے۔ پہلی بار انھوں نے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۸ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی دعوت پر بین الاقوامی غالب سیمینار میں شرکت کی۔ جبکہ بعد میں بھی وہ اسی ادارے کی دعوت پر دسمبر ۱۹۹۹ء میں میر تقی میر سیمینار میں شرکت کے لیے بھارت گئے۔ تاہم انھوں نے بھارت کے سفرنامے میں اپنے پہلے دورے کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ (ڈاکٹر شاہین مفتی کی کتاب میں اس بات کی صراحت موجود نہیں۔ ان کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید اس سفرنامے میں دونوں دوروں کو شامل کیا گیا ہے۔) بھارت کے پہلے دورے سے واپسی کے فوراً بعد انھوں نے یہ سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ اسی دور میں روزنامہ 'مشرق' لاہور کے ہفتہ وار میگزین مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء کی اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا۔ اخبار کا اپنا لے آؤٹ ہوتا ہے چناں چہ اخبار میں اس سفرنامے کی جو تین یا چار اقساط شائع کی گئیں ان کی پیش کش بڑے دھماکہ خیز

انداز میں ہوئی۔ مثلاً ان اقساط میں قارئین کی توجہ کھینچنے کے لیے اس نوع کی صحافتی سرخیاں جمائی گئیں:

''میں خود کو 007 محسوس کرنے لگا۔''(۲)

''بھارتی خواتین میک اپ کے بغیر آئینہ دیکھنے کی جرأت نہیں کرتیں۔''(۳)

۱۳/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو انھوں نے سرسید احمد خاں صدی تقریبات میں شرکت کے لیے ماریشس کا سفر اختیار کیا۔ ماریشس میں اپنے مشاہدات اور مصروفیات کو انھوں نے ''عجب سیر تھی'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ یہ سفر نامہ پہلی بار ''معاصر انٹرنیشنل''لاہور کے جنوری ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا جو ۲۷ صفحات پر مشتمل تھا۔

ماریشس جانے سے دو سال پہلے ۱۹۹۶ء میں وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے ڈنمارک گئے۔ ان کا یہ پینتالیس دن کا دورہ نجی نوعیت کا تھا۔ تاہم انھوں نے ایک تخلیق کار کی آنکھ سے ڈنمارک کو جس شکل میں دیکھا ہے اسے خوبصورتی سے اس مختصر سفر نامے میں بیان کر دیا ہے۔

۲۲ نومبر ۲۰۰۴ء کو انھیں ایک وفد کے ہمراہ ایک ہفتے کے دورے پر چین جانے کا موقع ملا۔ ان کے ہمراہیوں میں مشتاق احمد یوسفی، محمد اظہار الحق، ڈاکٹر شاہ محمد مری اور پروفیسر داور خاں داؤد شامل تھے۔ جنھیں وہ پانچ درویشوں اور پنج پیاروں کا نام دیتے ہیں۔ چین کا سفر نامہ بھی پہلے پہل تین اقساط میں ادبیات، اسلام آباد (۲۰۰۶ء)، معاصر انٹرنیشنل لاہور (۲۰۰۶ء) اور مخزن، لاہور (۲۰۰۶ء) کے پرچوں میں علی الترتیب ''سیر پانچ درویشوں کی''، ''چین: اِک جہاں سب سے الگ'' اور ''لعبتان چین اور جہان مرغ و ماہی'' کے عنوانات سے شائع ہوا۔

''عجب سیر تھی'' کے پہلے ایڈیشن میں چین کا سفر نامہ شامل نہیں ہے۔ ۲۰۱۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے اِسے شائع کیا تو اس میں چین کا سفر نامہ بھی شامل کر دیا گیا اور یوں یہ چار ملکوں کی سیاحت پر مشتمل سفر نامہ بن گیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے سفر نامے کی دوسری کتاب ''اِک جہاں سب سے الگ'' ۲۰۱۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ ۲۷۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ان کا امریکہ کا سفر نامہ ہے۔ امریکہ کا یہ سفر سیر و تفریح کی غرض سے کیا گیا چناں چہ امریکہ میں دو اڑھائی ماہ قیام کے دوران میں انھوں نے جہاں امریکہ کی تہذیبی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا وہاں اس سپر پاور کے دنیا بھر کے مما لک پر اثرات کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ۱۹۹۲ء میں اختیار کیا گیا سفر بعد میں سفر نامے کی صورت اختیار کر گیا۔ نوے کی دہائی میں اس سفر نامے کی تقریباً ۱۸ اقساط ملک کے معروف ادبی و نیم ادبی جرائد میں شائع ہوئیں۔ اِن جرائد میں اقدار، کراچی۔ سیپ، کراچی۔ ماہِ نو، لاہور۔ تخلیق، لاہور۔ صریر، کراچی۔ فنون، لاہور۔ ادبیات، اسلام آباد۔ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور اور معیار، کراچی شامل ہیں۔ ان اقساط کی تفصیل درج ذیل ہے:

امریکہ کولمبس سے پہلے	اقدار، کراچی (۱۹۹۳ء)

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں	سیپ، کراچی (۱۹۹۳ء)
پکچر پوسٹ کارڈز	سیپ، کراچی (۱۹۹۳ء)
نیوجرسی میں عید	اقدار، کراچی (۱۹۹۳ء)
شہر ہول	ماہِ نو، لاہور (فروری ۱۹۹۳ء)
فسانۂ عجائب	ماہِ نو، لاہور (اگست ۱۹۹۳ء)
جہانِ مرغ و ماہی	صریر، کراچی (اگست ۱۹۹۳ء)
سیکس کرنسی	تخلیق، لاہور (۱۹۹۳ء)
سیاہ پھوڑا (دو اقساط میں)	فنون، لاہور (۱۹۹۳ء)
مشعل بردار	تخلیق، لاہور (اگست ۱۹۹۳ء)
سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا	صریر، کراچی (جولائی ۱۹۹۴ء)
ذرا وائٹ ہاؤس تک	ادبیات، اسلام آباد (۱۹۹۴ء)
اِن ونڈر لینڈ	سیارہ ڈائجسٹ، لاہور (مئی ۱۹۹۴ء)
سیر پانچویں درویش کی	سیارہ ڈائجسٹ، لاہور (جون ۱۹۹۴ء)
توہم کا کارخانہ	سیارہ ڈائجسٹ، لاہور (جولائی ۱۹۹۴ء)
ثبوتِ حق: نیاگرا	معیار، کراچی (۱۹۹۴ء)

بعد میں جب کتاب شائع ہوئی تو اس میں بھی عنوانات کی فہرست میں معمولی تبدیلی سے ابواب کی یہی ترتیب قائم رکھی گئی ہے۔ البتہ ایک باب کا عنوان ''شہر ہول'' سے ''شہر نا ہنجار'' میں بدل دیا گیا ہے۔ اِسی طرح آخر میں ''انکل سام اور بھتیجے'' کے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اس سفرنامے کی اقساط ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۴ء کے سالوں میں جب ایک تسلسل سے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئیں تو انھیں قارئین کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا۔ ان دو برسوں میں قابلِ ذکر ادبی کام جو ملک بھر کے ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث بنا، یہی سفرنامہ تھا، جس میں لاہور کے کولمبس نے ایک نئے زاویے سے وسیع تناظر میں امریکہ کو دریافت کیا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اِن دو سفرناموں میں پانچ ملکوں کی سیاحت کا حال بیان کیا ہے۔ یہ پانچوں ملک اپنی تاریخ، جغرافیے، تہذیب وتمدن، بود و باش، زبان اور اپنے لوگوں کے سماجی رویوں کے حوالے سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ لیکن انھیں دیکھنے والی آنکھ ایک ہے جو محض بصارت پر اکتفا کرنے والی نہیں بلکہ اپنے پیچھے گہری بصیرت لیے ہوئے ہے۔ بلکہ اس بصیرت میں گہرا نفسیاتی شعور کارفرما ہے جو بظاہر نظر آنے والے چہروں کے سلگتے ہوئے احساسات اور کلبلاتے جذبوں تک کو اپنی گرفت میں لا کر فرد کی نفسی تحلیل کا ہنر جانتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی

شخصیت کا اہم رُخ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ نہیں کھلتے بلکہ جہاں گفتگو ہو رہی ہو، وہاں اُسے خاموش رہنا پسند ہے:

''میں سوشل اینمل نہیں ہوں ویسے بھی صحبت ناجنس سے خاصہ الرجک ہوں۔ اس لیے مجھ سے ہر کسی سے ہر موقع پر گفتگو نہیں ہوتی۔ نہ میں جلدی دوست بنا سکتا ہوں اور نہ ہی ہر ایک سے فوراً گھل مل جاتا ہوں، اس لیے سفر میں بطور خاص منہ بند کر کے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہوں بلکہ ان لوگوں پر تعجب کرتا ہوں جو سفر میں تاش کھیلنے لگتے ہیں۔ گھریلو امور پر مشورہ طلب کرتے اور کاروباری رازوں میں شریک کر لیتے ہیں۔'' (۴)

اِس نوع کا مزاج رکھنے والے شخص سے آپ یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ محض گفتگو کے سہارے سارے سفر بتا دے اور دوسرے کو اپنی باتوں سے متاثر کر کے زیرِ دام لے آئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تو اکثر اپنی تحریر میں بھی خاموش رہتے ہیں اور ناگفتنی کو ناگفتنی ہی رہنے دیتے ہیں۔ ان کے ہم عصروں میں کئی ایسے سفر نامہ نگار مل جائیں گے جو اپنے بول بچن سے طولِ شب فراق ماپتے اور ذرا سی بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے سفر نامے کے حوالے سے ایک پتے کی بات کہہ دی ہے اور یہی وہ اصول ہے جسے انھوں نے ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر اپنے لیے پسند کیا ہے اور اِسے وہ از راہِ تفنن ''مردِ شریف کا المیہ'' کہتے ہیں :

''اگر آپ نے......رومانی جذباتی بلکہ ہیجانی سفر نامے کی توقع پر اس تحریر کا مطالعہ شروع کیا ہے تو براہ کرم اپنا قیمتی وقت ضائع مت کیجیے، کہیں اور دستک دیجیے۔ میں تو ایک بے ضرر قلم کار اور خشک مقالات قلم بند کرنے والا نقاد ہوں...... میں تو اس مخمصے میں بھی ہوں کہ یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے سفر نامہ کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ شاید یہ رپورتاژ ہو ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سرے سے کچھ بھی نہ ہو بجز یادوں پر مبنی ایک تاثراتی تحریر کے، لیکن ہو گی سچ۔ جو دیکھا وہی لکھوں گا اور جو محسوس کیا وہی ضبطِ تحریر میں لاؤں گا۔'' (۵)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر سفر نامے پر بھی آپ بیتی جیسی شرائط عاید کرتے ہیں اور جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لے کر قاری کو گمراہ کرنے کا ''خطرہ'' مول لینے کو تیار نہیں۔ ایک سفر نامہ اور آپ بیتی ہی نہیں، ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی دیگر تحریروں بشمول تنقید وغیرہ کے لیے بھی ایسے ہی اصول قائم کر رکھے ہیں جن سے گریز انھیں گوارا نہیں۔ اِسی باعث ان کی ہر تحریر کو قاری کا اعتماد حاصل ہے اور اُسے سند کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے جن ممالک کا سفر کیا، ان کے بارے میں وہ تحقیقی حوالے سے معلومات کا انمول ذخیرہ فراہم کرتے ہیں اور یہ تحقیقی مواد وہ مستند ذرائع سے حاصل کرتے ہیں مثلاً امریکہ کے سفر نامے کے آغاز ہی میں انھوں نے کولمبس کی دریافت سے پہلے کے امریکہ کی صورتِ حال بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں جغرافیہ دانوں، مورخین اور علم الانسان کے ماہرین کے قیاسات، مفروضوں اور نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ سب نظریات مستند نہیں ہیں۔ چناں چہ آثار و قرائن کے بہ موجب وہ یہ قیاس قائم کرتے ہیں کہ:

''بارہ سے بیس ہزار سال قبل شمالی امریکہ اور روس کا بالائی حصہ پیوست تھا اور الاسکا اور گلیشیر کے ''پُل'' سے منسلک تھے۔ موسمی تغیرات، خوراک کی کمی یا کسی اور وجہ سے جب نقل مکانی کا آغاز ہوا تو کچھ گروہوں نے ایشیا کا رُخ کیا اور ہندوستان، افغانستان، ایران اور ترکی تک پھیل گئے جبکہ کچھ ایسے گروہ تھے جو اس گلیشیر کے پل کے ذریعے امریکہ وارد ہوئے۔ ہزاروں برس بعد جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث یہ پُل ٹوٹ گیا اور روس اور امریکہ الگ ہو گئے اور ایسے الگ ہوئے کہ ۱۴۹۲ء تک دنیا امریکہ کے وجود سے بے خبر رہی۔ کولمبس کی آمد سے پہلے تک یہاں ایک ہزار کے قریب ریڈ انڈین قبائل آباد تھے جن کے افراد کی تعداد اندازاً دس سے بیس لاکھ تھی۔ ماہرین لسانیات نے قدیم امریکی زبانوں کی تعداد دو تین سو سے لے کر تین ہزار تک بتائی ہے جبکہ ہر زبان کم از کم بیس ہزار الفاظ پر یقیناً مشتمل ہوتی تھی۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اُن قبائل کے نام بھی درج کیے ہیں جو اُس وقت امریکہ میں موجود تھے۔ (۶) اسی طرح اُن قبائل کے عادات واطوار، رسم ورواج اور بودوباش کے بارے میں اہم معلومات پیش کی ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سفرنامے کا یہ باب خاصے کی چیز ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر ایک سفر نامہ نگار سے زیادہ ایک محقق اور تاریخ دان کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اِسی نوع کی تحقیقی معلومات ماریشس اور ڈنمارک کے سفرناموں میں بھی نظر آتی ہیں مثلاً ماریشس کے سفرنامے میں لکھتے ہیں :

> ''ماریشس کو قدرت کا عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔ دنیا بھر کے جغرافیہ سے منقطع یہ جزیرہ اور اس کے پڑوسی ''سیشلز'' نے بھی غالباً صدیوں پہلے آتش فشانی کے عمل سے آبی نقاب اتار کر دنیا والوں کو مکھڑا دکھایا ہوگا...... ماریشس کو ڈیڑھ بالشت کا جزیرہ سمجھنا چاہیے کہ محض ۴۲ × ۵۷ کلومیٹر ہے اور آبادی لاہور شہر جتنی بھی نہیں یعنی کل ۱۲لاکھ افراد۔ افریقہ میں حکومت کی وجہ سے چھٹی صدی میں عربوں نے اسے دریافت کیا اور یہ بحری تجارت میں کارآمد ثابت ہوا۔ سولہویں صدی میں ولندیزی، اٹھارہویں صدی تک فرانسیسی اور انیسویں صدی میں انگریز اس پر قابض رہے۔ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں آزاد ہوا۔ اَب یہاں جمہوری حکومت ہے۔'' (۷)

ڈنمارک کے سفرنامے سے یہ اقتباس دیکھیے :

> ''چہار اطراف سے پانی میں گھرے ڈنمارک میں خشکی صرف ۱۶۶۲۵ مربع میل ہے۔ آبادی نصف کروڑ سے کچھ زیادہ اور یہ آبادی بھی ان بیس فیصد جزائر پر ہے جو اتنے بڑے ہیں کہ آبادی کا بوجھ برداشت کر سکیں لیکن بقیہ اسی فیصد غیر آباد جزائر، بے نام، بے زیست اور لاتعلق، لہروں کے خروش میں مگن، صرف نقشے میں وجود رکھنے والے جبکہ بعض بالشت بھر کے تو نقشے میں بھی ظاہر نہ کیے جا سکیں۔''
>
> ''ڈنمارک بذاتِ خود ۵۲۷ جزائر پر مشتمل مجمع الجزائر ہے۔ بعض جزیرے بڑے تو بعض چھوٹے بلکہ بعض بالکل ننھے منے سے، کسی بڑے جزیرہ کی اولاد کی مانند...... سب سے بڑا جزیرہ محض

۲۷۰۰ مربع میل ہے جبکہ چند میلوں کے چھوٹے جزیرے بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ ۴۴۵ جزیرے تو سمندر کی اولاد ہیں جبکہ بقیہ ۸۲ جزائر بڑی بڑی جھیلوں، وسیع پانی والے دریاؤں اور آبنائے وغیرہ میں ہیں۔''(۸)

بھارت اور چین کے سفرناموں میں ڈاکٹر سلیم اختر نے عمداً جغرافیے اور تاریخ سے کم سروکار رکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اُردو زبان کا قاری اِن دونوں ممالک کے جغرافیے اور تاریخ سے اتنا ضرور واقف ہے کہ اُسے مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں اور ڈاکٹر سلیم اختر قاری کی اِس نفسیات سے بخوبی واقف ہیں کہ جو معلومات اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں، انھیں دہرا کر صفحے کالے کرنا سفر کو کھوٹا کرنا ہے۔ قاری کو اصل غرض اِس بات سے ہے کہ اجنبی اور نامانوس سرزمینوں پر اُترتے ہوئے اُن کے جذبات اور احساسات کیا تھے اور ان منظروں کو انھوں نے کس آن میں دیکھا، جنھیں دیکھنے کی خواہش ہر دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور یہ کہ اِس سفر کی تیاری میں کیا مرحلے پیش آئے اور انھیں کن صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے پانچوں سفرناموں میں اِس امر کا بخوبی اہتمام کیا ہے اور ویزوں کے حصول میں حائل مشکلات کو اپنے خوشگوار اسلوب میں بیان کر کے صعوبتوں اور مشکلوں کی داستان کو مزاح میں ملفوف کر دیا ہے۔ ذرا اِن سطور کا لطف لیجیے :

''بھارت کا ویزا لینا بھی آسان کام نہیں۔ اس کا اندازہ مجھے سفارت خانے پہنچ کر ہوا۔ مجھے تو یاروں نے یہ تاثر دیا تھا کہ میں جیسے ہی دروازے پر پہنچوں گا مجھے اکیس توپوں کی سلامی دی جائے گی اور عزت مآب سفیر میرے چرن چُھو کر کہیں گے کہ ہم تو تشریف آوری کے کب سے منتظر کھڑے ہیں، دراصل پاکستان اور بھارت کے تعلقات جو اَب تک نہیں سُدھر سکے تو اس کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر نہیں بلکہ ہمارا بھارت تشریف نہ لے جانا ہے۔ الغرض وہ اس قسم کی باغ و بہار تقریر کریں گے اور مراد آبادی کام کی منقش چاندی کی طشتری میں ویزا رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کریں گے......لیکن ہم اس حُسنِ سلوک سے اس لیے محروم رہے کہ ایک رازدار نے ہمارے کان میں پھونک دیا کہ اگر مرکزی دروازے سے سفارت خانے کے اندر داخل ہو گئے تو خفیہ والے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے کہ اَب ہمارے پاس خطا کرنے کو صرف اوسان ہی بچے تھے۔''(۹)

ماریشس کا سفر ڈاکٹر سلیم اختر کے لیے خاصا اذیت ناک رہا۔ انھیں لاہور، کراچی، نیروبی، ماریشس تک کا ہوائی سفر چودہ گھنٹوں میں طے کرنا تھا اور اس کے لیے چار جہاز بدلنا تھے۔ ان طیاروں کے انتظار میں انھیں مجموعی طور پر بیس گھنٹے مختلف ہوائی اڈوں پر گزارنا پڑے:

''یہ سفر کئی ہزار میل کا تھا، تب میں سمجھا کہ باقی شاعروں اور ناقدین نے ماریشس جانے سے کیوں انکار کر دیا۔ تنہا طویل مسافت بذاتِ خود عقوبت ہوتی ہے۔''(۱۰)

رات ساڑھے دس بجے نیروبی پہنچنے کے بعد انھیں اگلے روز دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے کی فلائٹ سے ماریشس پہنچنا تھا۔ گویا انھیں تقریباً پندرہ گھنٹے نیروبی ایئرپورٹ پر گزارنا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس قدر طویل قیام کے لیے ضرور ہوٹل میں بندوبست کیا گیا ہوگا لیکن :

''جب سفر چار جہازوں سے ہورہا ہو اور وہ بھی چار جداگانہ ایئر لائنز سے تو ہمارا ذمہ دار کون بنتا؟ لہٰذا میں نے اس رات اجنبی ملک کے نامانوس ایئرپورٹ پر خود کو لاوارث سامان کی مانند پایا۔ ایئرپورٹ کے کاؤنٹر پر کھڑے حبشی سے بات کی، اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں دوڑائیں، میرا ٹکٹ دیکھا، پاسپورٹ ملاحظہ کیا اور خوش خبری سنائی کہ میرے نام کی کسی ہوٹل میں بکنگ نہیں۔'' (۱۱)

امریکہ کے سفر میں لاہور سے روانگی کے وقت پی آئی اے کے ''باکمال لوگ لاجواب پرواز'' کا حال بھی دیکھیے :

''اگرچہ پی آئی اے نے بکنگ اور سیٹنگ کا کمپیوٹرائزڈ سسٹم اپنا رکھا ہے اور بڑے اہتمام سے ٹکٹ پر نام، تاریخ، فلائٹ نمبر، منزل مقصود، سیٹ نمبر حتیٰ کہ گیٹ نمبر تک بھی درج کیا جاتا ہے لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ طیارہ میں داخل ہونے پر ایئر ہوسٹس تمام طیارہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر دیتی ہے۔ انداز ایسا ہوتا ہے گویا کہہ رہی ہو جہاں چاہو دفع ہو جاؤ۔ اس کا نتیجہ جس بدنظمی، الجھن اور افراتفری کی صورت میں نکلتا ہے، طیارہ کے حجم کی مناسبت سے اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ تو خیر سے جمبو جیٹ تھا، لہٰذا یوں محسوس ہو رہا تھا گویا سینما میں سیٹیں تلاش کی جا رہی ہوں۔'' (۱۲)

اِن چند مثالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر گمبھیر صورتِ حال میں بھی اپنے اسلوب کی کاٹ سے بات کو معنی خیز بنا دیتے ہیں اور قلم کو لٹھ بنانے کے بجائے بڑے سبھاؤ سے باریک نشتر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر ہی جاتا ہے۔ انھیں اپنا اسلوبیاتی مزاج اتنا عزیز ہے کہ سخت سے سخت مقام پر بھی وہ آپے سے باہر نہیں ہوتے اور مذاق مذاق میں بات ٹال کر آگے نکل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ایک سفر نامے کے آغاز میں اپنے سفر ناموں کے مزاج کی بات کر دی ہے کہ ان کے سفر ناموں میں ان کے لیے کوئی کنواری کنیا سبز ساڑھی کے سنہرے پلو سے بھیگی آنکھوں سے کاجل صاف کرتی ہوئی نہیں ملے گی اور نہ ہی وہ ایسی آزردہ خاتون کو الوداعی مسکراہٹ سے نوازتے ہیں اور نہ ہی ان کے سفر میں کوئی ایسا مقام آتا ہے جہاں اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے رنگوں کی ساڑھیوں میں ملبوس، سانولے ماتھوں پر پنکھڑی اِک گلاب کی سی بندیا دمکائے، کلائیوں میں دھانی بانکیں، جُوڑوں میں پھول اور بالوں میں گجرے سجائے، انھیں دیکھ کر مستی کے عالم میں بھاگتی ہوئی آئیں اور انھیں گھیرے میں لے کر خوشی کے نعرے لگائیں اور پیتل کی تھالیوں میں دیپ جلائے ان کی آرتی اتاریں۔ ڈاکٹر شاہین مفتی نے لکھا ہے کہ اُن کے سفر ناموں کی زبان افسانوی ہے۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے پڑھ رکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے افسانوں کی بنیادی تھیم ہی

عورت ہے۔ عورت کی نفسیات کو انھوں نے جس اتھاہ میں اُتر کر دریافت کیا ہے اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اپنے اس افسانوی اُسلوب کو کام میں لا کر وہ دیگر مشہور سفر نامہ نگاروں سے کہیں بہتر انداز میں اپنے سفر ناموں کی دل کشی اور سندرتا میں اضافہ کر سکتے تھے لیکن انھوں نے افسانے اور سفر نامے میں ایک حدِ فاصل کھینچ کر خود کو اِس امر سے باز رکھا ہے۔ سفر نامہ، حقیقت نگاری کا تقاضا کرتا ہے، منظر کشی بھی ہو تو اس انداز میں جیسے کوئی کیمرے سے تصویر کھینچ کر نقل کو اصل کے آئینے میں پیش کر دے۔ خوبصورت خواتین کا ذکر کر کے جذبات کو آسودہ کرنا، یا اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان سے نسبت جتا کر خود کو ایک محبوب کے روپ میں پیش کرنا محض اُلفتِ ذات کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی آپ بیتی میں خود کو ایک حسن پرست شخص ضرور کہا ہے۔ انھوں نے خود اپنی تحلیل نفسی کر کے اپنی ذات میں نرگسیت کے آثار بھی تلاش کیے ہیں۔ لیکن آپ اُن کی پوری تنقید اُٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ اس شخصیت کو تلاش کرنے میں ناکام رہیں گے جو ضبط کی دیوار جیسے ناولٹ یا کڑوے بادام، کاٹھ کی عورتیں، مٹھی بھر سانپ، چالیس منٹ کی عورت، آدھی رات کی مخلوق اور جرس غنچہ کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے تنقید، افسانہ، انشائیہ اور دیگر کئی اصناف سخن میں بے تکان لکھا ہے لیکن اِن ساری اصناف کو ایک ہی اُسلوب کی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر صنف خود اپنا ایک اسلوب متعین کرتی ہے اور لکھنے والے سے اس اسلوب کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ ایک نفسیاتی نقاد کے طور پر مشہور ہیں لیکن اپنی تنقید میں انھوں نے ہر جگہ نفسیات سے کام نہیں لیا بلکہ عمرانیات اور دیگر شعبوں سے بھی رجوع کیا ہے۔ ایسی صورت میں انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اصل کو اصل کے تناظر میں دیکھا جائے۔ کہیں منظر کشی کرتے ہوئے یا نازک صورتِ حال کو سنبھالا دیتے ہوئے ان کے سفر ناموں میں افسانوی رنگ کا گمان گزرتا ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے اسی رنگ کو اپنے سفر ناموں کا لازمہ بنا لیا ہے۔ پانچ ملکوں کے سفر میں جگہ جگہ کے منظر لطف آمیز پیرائے میں کھولے ہیں۔ ان میں سانولی سلونی، گوری چٹی، سنہرے بالوں والی، سیاہ زلفوں والی عورتیں بھی نظر آتی ہیں لیکن قاری انھیں کسی مقام پر بھی ریشہ خطمی ہوتے نہیں دیکھتا۔ وہ حُسن پر دیوانہ وار لہلوٹ ہونے کے بجائے بے نیازی کے عالم میں حسن بے پایاں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر آگے نکل جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ سفر نامہ لکھ رہے ہیں۔ ایک نقاد کے طور پر انھوں نے قدیم اور جدید ہر نوع کے سفر ناموں کو کھنگال رکھا ہے۔ وہ سفر نامے کی ہئیت سمیت اس کی تمام تر جزئیات کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ میری رائے میں معیاری اور متوازن سفر نامے کا لطف لینا ہو تو ''عجب سیر تھی'' اور ''اِک جہاں سب سے الگ'' جیسے سفر ناموں کو پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ سفر نامے نہ تو تاریخ اور تحقیق کی کھتونی بننے پائے ہیں اور نہ ہی کوئی افسانہ یا ناول ـــــ واقعات کی صحت، تاریخی حقائق اور سفر کا احوال اور ذاتی مشاہدات جس طرح رَل مل کر اِن سفر ناموں میں آئے ہیں، کہیں اور نظر نہیں آتے۔ ہمارے تحقیق کے جویا اور ادب کا صنفی مطالعہ کرنے والوں کو اِن سفر ناموں سے بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جو کار آمد ہی نہیں، ادب کی نئی جہتوں کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۰۵

۲۔ مشرق میگزین، (لاہور، ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء)، ص ۱۶

۳۔ مشرق میگزین، (لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۸۹ء)، ص ۹

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اِک جہاں سب سے الگ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۷

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۸

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اِک جہاں سب سے الگ، ص ۷، ۸

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، ص ۸۸، ۸۹

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، ص ۱۱۸

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، ص ۹، ۱۰

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، ص ۷۷

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، ص ۷۸

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اِک جہاں سب سے الگ، ص ۲۷

مآخذ:

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اِک جہاں سب سے الگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عجب سیر تھی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

۳۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن، سلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۵ء۔

☆☆☆